نظرات

اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد مسلم قیادت یعنی وہ قیادت جو تقسیم ملک کی تحریک کے وقت کانگریس کی ہم نوا اور اس کے ساتھ تھی بدستور مؤثر اور قومی سیاست میں بدستور فعال رہی تو ہمیں ان بے شمار اقدامات کا جواز ڈھونڈنے میں بڑی دقت پیش آئے گی، جو اس مسلم قیادت کی موجودگی میں جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی، آصف علی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور حافظ محمد ابراہیم جیسے لوگ شامل تھے مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور انکے تہذیبی تفوق کو ختم کرنے کے لئے اٹھائے گئے، اور اتنے کارگر اور دوررس تبدیلیوں کے حامل ثابت ہوئے کہ متحدہ قومیت کا وہ تناور درخت جو ہندو اور مسلمانوں کی صدیوں کی محنت اور دونوں مذہبوں کی بہتر روایات کے قلم سے تیار ہوا تھا اس زہریلی آبیاری سے مرجھانے اور سوکھنے پر مجبور ہوگیا جو آزادی کے فوراً بعد مسلم قیادت کی موجودگی میں شروع ہوگئی تھی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ساری صورت حال کو پیدا کرنے میں مسلم لیگ کی اس قیادت کا حصہ بھی تقسیم ملک کے اثرات سے کچھ کم نہیں ہے جو تقسیم کے بعد ہندوستان میں باقی رہ گئی تھی اور یہاں رہ کر ہندوستان کے غیر مسلم لیڈروں کی خوشامد کے ذریعہ اپنی وجاہت اور اہمیت کو قائم رکھنا چاہتی تھی،

مسلم لیگ کے رہنمائوں نے صرف اتنی ہی بات نہیں کی تھی کہ انھوں نے جذباتی سیاست کی بھٹی کو سلگا کر منافرت کی ایک ایسی آگ بھڑکا دی کہ ملک کی تقسیم اسکے سامنے کم خوفناک نظر آنے لگی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب انھوں نے تقسیم ملک کے نتائج اپنے خوابوں اور اپنے اندازوں کے برعکس نکلتے دیکھے تو مسلم عوام کی تباہ کن آزمائشوں اور مصائب میں ان کا ساتھ دینے کے بجائے وہ نئے ملک پاکستان میں فرار ہو گئے، اور ان لوگوں کو بے سہارا اور بے یار و مددگار چھوڑ گئے جنھوں نے ان کے بلند بانگ دعووں، ان کے دلکش وعدوں اور ان کے جذباتی نعروں کے فریب میں آکر اپنے مستقبل کو نامعلوم مدت کے لئے تاریک اور سیاہ کر لیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب طرز عمل ان لوگوں نے اختیار کیا جو اپنی ذاتی اور نجی مصلحتوں اور مفادات کے تحت ہندوستان میں قیام کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور بخوشی ان لوگوں کے آلۂ کار بننے کے لئے تیار ہو گئے جو انھیں ہندوستان کی باقی ماندہ مسلم آبادی کو ہمیشہ کیلئے بے دست و پا کرنے کے مقصد میں استعمال کرنا چاہتے تھے

ہمارے اس خیال کے حق میں صرف ایک مثال کافی ہوگی جو اس وقت سامنے آئی جبکہ مسلمانوں کے مستقبل کو ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش تھا، اور مولانا آزاد نے دستور ساز اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب اور سیٹوں کے ریزرویشن کا نظام کچھ دنوں کے لئے باقی رکھا جائے۔ اس وقت بظاہر کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ مولانا آزاد کی تجویز کی مخالفت کسی مسلم لیڈر کی طرف سے کی جا سکتی ہے اور اس میں بھی کسی کو شک نہ تھا کہ اگر اس تجویز کی مخالفت نہ ہوتی تو دستور ساز اسمبلی میں اس تجویز کو منظور کرانے میں انھیں کوئی دقت اور دشواری پیش نہ آتی۔ لیکن ابھی اس تجویز پر مباحثہ ابتدائی مرحلہ سے آگے بھی نہ بڑھا تھا کہ مسلم لیگ کے مشہور لیڈر اور اتر پردیش

میں زنانہ مسلم لیگ کی صدر بیگم قدسیہ اعزاز رسول تقریر کرنے کھڑی ہو گئیں اور انھوں نے جداگانہ طرز انتخاب اور مسلمانوں کی سیٹوں کے ریزرویشن کی اتنے زوردار انداز مخالفت کی اور اس طریقہ کو مسلمانوں کے لئے انتہائی نامناسب قرار دیکر مخلوط انتخاب کی اپنے واضح الفاظ میں وکالت کی کہ خود مولانا آزاد ان کے غیر متوقع طرز عمل کو دیکھ کر لڑکھڑا گئے، اور ان پر فی الواقعہ ایک طرح کی حواس باختگی جیسی کیفیت طاری ہو گئی، سردار ولبھ بھائی پٹیل نے مولانا آزاد کی اس کیفیت کو مسرت کے ساتھ دیکھا بڑے طنزیہ اور پرمسرت لہجہ میں انہوں نے کہا:

”اب قابل احترام مولانا صاحب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمام مسلمان صرف ان کے خیال اور رائے کے حامی نہیں ہیں بلکہ کچھ معزز ممبران دستور ساز اسمبلی انکے خیال اور رائے کے خلاف بھی رائے رکھتے ہیں“۔

سردار پٹیل کے اس تبصرے کے بعد اس میں تو کسی کو شبہ نہ رہا کہ بیگم قدسیہ اعزاز رسول کی مخالفانہ تقریر کا اصل سبب کیا تھا اور ان کے پیچھے اصل شخصیت کس کی تھی لیکن مولانا آزاد کی تجویز اور مسلمانوں کے مستقبل کا سوال البتہ ایسے خطرے میں پڑ گیا کہ اسکی تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طرز انتخاب اور سیٹوں کے ریزرویشن کی تجویز نامنظور ہو گئی اور اسی کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی آئندہ کیلئے سبق مل گیا کہ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں کے اس رویہ کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھیں کہ مسلمانوں کے خلاف آئندہ جو بھی اقدامات حکمراں طبقہ کی طرف سے کیے جائیں گے ان سب کو بیگم قدسیہ اعزاز رسول اور ان کے ساتھیوں کی غیر مشروط تائید حاصل ہو گی۔

مذکورہ تجویز کی معقولیت یا غیر معقولیت سے قطع نظر سب سے زیادہ حیرت انگیز

اس بات کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ جو بیگم قدسیہ اعزاز رسول کل تک جداگانہ طرزِ انتخاب اور مسلمانوں کی سیٹوں کے ریزرویشن کی سب سے زیادہ حامی تھیں، وہ صرف ایک دن میں نہ صرف اس طریقِ انتخاب کی مخالف ہو گئیں بلکہ اسے مسلمانوں کے مفاد اور اجتماعیت کے لئے خطرناک اور نقصان دہ قرار دینے سے بھی انھیں کوئی پس و پیش نہیں ہوا۔ بیگم قدسیہ اعزاز رسول ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ اور کانگریس کا ٹکٹ انھیں ابھی تک اپنے حلقۂ انتخاب سندیلہ سے انتخاب لڑنے کے لئے ہر الیکشن کے موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔

یہ مثال ہم نے اس خیال کے تحت پیش کی ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد سے ہی سے کوئی قیادت ہی نہ رہ گئی تھی اسکے بجائے موقع پرستوں اور مفاد پرستوں کے ایسے گروہ یہاں پیدا ہو گئے تھے جو مسلمانوں کے وجود اور ان کے اجتماعی مفاد کی قیمت پر اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کی راہ پر چل پڑے تھے اور ان کا یہ رویہ اتنا واضح اور واشگاف تھا کہ مسلم سیاست کے غیر مسلم مبصر آج تک اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ جو لوگ ایک دن پہلے تقسیم ملک کے سب سے بڑے علم بردار اور اس کے بانی مبانی ثابت ہوئے تھے وہ ایک ہی دن میں ان لیڈروں اور حکومت کے ان اساطین کے منظورِ نظر کیسے ہو گئے جن کا دعویٰ تھا کہ مسلم فرقہ پرستوں کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹیں اور ناقابل عبور مزاحمت سے نجات پانے کیلئے انھوں نے مجبوراً تقسیم کو منظور کیا تھا۔

کانگریس کے مسلم لیڈروں سے ان بڑے لیڈروں کو دو گونہ شکایات تھیں جو آزادی کے بعد ملک کے اقتدار اور حکومت کے مالک بنے تھے، وہ آج کی

ہندو قیادت کی طرح اپنے آپکو سو فیصدی برحق اور خطاؤں و غلطیوں سے پاک سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلم رہنماؤں کا مسلم عوام پر کوئی اثر نہیں ہے جیسے الیکشن میں کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اپنی ذرا سی بھی غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے جو خود ان سے سنہ ۳۷ء کی وزارتوں کی تشکیل، اس کے بعد طرز حکومت اور اس کے بعد قومی سیاست اور مسلم لیگ کی سیاست بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ طرز عمل طے کرنے کے معاملات میں ہوئی تھیں اسکے بجائے وہ کانگریس کی ناکامی کا سو فیصدی ذمہ داران مسلم رہنماؤں کو سمجھتے تھے جو کانگریس میں شامل تھے۔ یا قوم پرست جماعتوں کے ذریعہ کانگریس سے باہر رہ کر تقسیم ملک کی مخالفت اور مسلم لیگ کی مزاحمت کر رہے تھے دوسرے وہ مسلم رہنماؤں سے اس معاملے میں ایک طرح کا حجاب محسوس کرتے تھے کہ تقسیم ملک پر رضامندی میں انھوں نے انکی رائے کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی تھی، یہاں تک کہ ۹۰ فیصدی مسلم آبادی والے صوبہ سرحد کو بھی جہاں کے مسلم لیڈر ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خاں جیسے نازک لمحوں میں بھی کانگریس کے ساتھ رہے تھے یہاں تک کہ انکی زیر قیادت سنہ ۴۶ء کے الیکشن میں صوبہ سرحد کے مسلم عوام میں کانگریس کے حق میں اور مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دیکر کانگریس کو اکثریت دلوائی تھی اور جہاں تقسیم کے وقت بھی کانگریس ہی کی وزارت قائم تھی تقسیم ملک کے سمجھوتہ کے نتیجے میں پاکستان کے حوالے کر دیا، اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خاں صاحب خان سے مشورہ تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جسکی شکایت خان عبدالغفار خاں آج تک کرتے رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس کے حامی مسلم لیڈر جنھیں اس زمانہ

میں قوم پرست کہا جاتا تھا سب کے سب تقسیم ملک کے نہ صرف خلاف تھے بلکہ آخر تک اس کے خلاف رہے اور بلا استثناء اپنی شدید مخالفت کو ظاہر کرتے رہے لیکن کانگریس کے وہ لیڈر جو ایک سخت اور اعصاب شکن جد و جہد سے تھک کر چور ہو چکے تھے اور اب ہر قیمت پر اقتدار اور اسکی برکتوں سے مستفیض ہونے کے خواہاں نظر آنے لگے تھے، ہندو مسلم سیاسی تنازعہ کے بہر قیمت، یہاں تک کہ تقسیم کی قیمت پر بھی تصفیہ کے حق میں ہو گئے تھے، اغراض اور عجلت پسندی نے ان کی دور اندیشی کی صلاحیت کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ تقسیم ملک کو سنجیدگی کے ساتھ فرقہ واریت کا اطمینان بخش حل سمجھنے لگے تھے، اور مسلم رہنماؤں کے اس نقطۂ نظر کو ذرا بھی اہمیت دینے پر تیار نہ تھے کہ تقسیم کی بدولت فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور زیادہ الجھ جائے گا، وہ اس سلسلے میں قوم پرست مسلمانوں سے اس درجہ بے پرواہ ہو گئے تھے کہ ان کا وجود ہی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کے احساسات کا اندازہ سردار پٹیل کے اس مشہور جملہ سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے قوم پرست مسلمانوں کے بارے میں اس وقت کہا تھا جب ایک اہم مسئلہ پر انھیں مسلم رہنماؤں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنے پر متوجہ کیا گیا تو انھوں نے کہا۔

”کون قوم پرست مسلمان ـ ؟ میں تو کانگریس میں صرف ایک قوم پرست مسلمان کو جانتا ہوں اور اس کا نام جواہر لال نہرو ہے ــ “

حقیقت یہ ہے کہ جد و جہد آزادی کے آخری اور آزادی کے ابتدائی دنوں میں کانگریس نظریاتی اعتبار سے انتشار اور پراگندگی کا اس درجہ شکار ہو گئی تھی کہ نظریات کو اہمیت دینے والے اور کانگریس کے نصب العین اور بنیادی پالیسی کا خیال اور

احترام کرنے والے بس گنتی ہی کے چند آدمی کانگریس میں رہ گئے تھے اور جہاں تک تقسیم کا سوال ہے تو ایک گاندھی جی کے سوا بڑے لیڈروں میں کوئی مخالف نہ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ قوم پرست مسلمان صرف گاندھی جی کی صحبت میں سکون محسوس کرنے لگے تھے۔ اس زمانے میں کانگریس دائیں بازو کے لیڈروں پر فرقہ وارانہ نظریات کا غلبہ اتنی جھلک گئی تھی کہ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کھلے بندوں ہندو دشمن سمجھے جا رہے تھے ہندوؤں کے واحد ترجمان سردار پٹیل قرار دیدیے گئے تھے اور یہ صورت گاندھی جی کے مظلومانہ قتل سے پہلے کے آخری لمحوں تک قائم رہی جبکہ ایک معلوم حقیقت کے طور پر سردار پٹیل یہ کہکر گاندھی جی کے پاس سے اٹھے کہ "مہاتما جی تو ہندوؤں کو ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں" ۔۔۔ سردار پٹیل سے اس آخری ملاقات کے پانچ منٹ بعد ہی گاندھی جی برلا مندر کی پرارتھنا سبھا میں پہنچے جہاں ان کے قاتل ناتھو رام گوڈسے نے گولی مار کر انکی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ گاندھی جی کی وفات کے بعد ملک بھر کی آنکھیں کھلیں لیکن فرقہ واریت کا وہ زہر جو ابل کر اس درجہ پھیل گیا تھا کہ اس نے ہر چیز کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھک لیا ہے ایک بار پھر سمٹ کر سیاست اور ذہنوں کی تہوں میں چلا گیا، اس صورتحال کی بدولت قوم پرست مسلمانوں کو حکومتی شعبوں اور قومی لیڈروں میں دخیل ہونے کا ایک بار پھر موقع ملا لیکن انکی یہ دخل کاری کسی عوامی قوت کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ پرانے ساتھیوں کے پاس و لحاظ سے زیادہ اسکی کوئی حقیقت نہیں تھی جہاں تک سیاسی اور انتظامی معاملات کا تعلق ہے کانگریس کے لوگ قوم پرست مسلمانوں کے مقابلے میں مسلم لیگ کے باقی ماندہ لیڈروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کو ترجیح دیتے تھے جو انکی ہاں میں ہاں ملانے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے، اسلئے ہم نے کہا کہ مسلمانوں کی قیادت دراصل ۴۷ء کے بعد پیدا ہی نہیں ہوئی صرف موقع پرستی کا وہ رجحان جو باقی ماندہ مسلم رہنماؤں میں ابھر آیا تھا باقی رہا، اسی رجحان کے سایہ میں آگے چلکر وہ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے خود اپنے آپ کو مسلم قیادت کے منصب پر قائم کر لیا۔ مسلم عوام میں انکے انتخاب میں کوئی حصہ تھا نہ ان میں سے کوئی عوامی طبقہ سے ابھر کر اونچے درجہ کی قیادت میں شامل ہوا تھا ——

برہان کا مفکر ملت نمبر کتابت کی دشوار گذار گھاٹیوں سے نکل گیا ہے اور طباعت کے مرحلوں میں ہے امید ہے کہ اکتوبر کے وسط آخر تک طباعت کا مرحلہ بھی طے ہو جائیگا۔ اگر کوئی خاص رکاوٹ درمیان میں حائل نہ ہوئی تو اکتوبر کے آخر تک ہی ۵۰۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر شائع ہو جائے گا۔